خرم مرادؒ

پاک امریکہ تعلقات

پاکستانی حکمرانوں نے شروع ہی سے یہ طے کر کے امریکہ سے تعلقات قائم کیے تھے کہ انہیں صرف امریکہ ہی کا بن کر رہنا ہے، کسی اور کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھنا۔ بیچ میں روٹھنے اور خود ہی من جانے کے کچھ مراحل آئے لیکن حکمراں "وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے" کی راہ پر گامزن رہے اور ہمارے خیال میں اب بھی ہیں۔

صدر ٹرومین نے ۱۹۴۹ء میں بھارتی وزیر اعظم پنڈت نہرو کو امریکہ کے دورے کی دعوت دی اور پاکستان کی خواہش کے باوجود لیاقت علی خاں کو نظر انداز کر دیا۔ جب انہوں نے روس کی طرف سے ماسکو کے دورہ کی دعوت قبول کر لی تو صدر ٹرمین نے ۲۲ نومبر ۱۹۴۹ء کو انہیں دورۂ امریکہ کی دعوت دے دی، لیاقت علی خان نے جھٹ سے ماسکو کا دورہ منسوخ کر دیا۔ یہ دورہ ایسا منسوخ ہوا کہ پھر اس کے ۱۶ سال بعد صدر ایوب پہلے پاکستانی سربراہ تھے جو اپریل ۱۹۶۵ء میں ماسکو گئے۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں، جبکہ روس ایک عالمی طاقت تھا اور پاکستان کا پڑوسی بھی۔

امریکہ سے تعلقات کی خاطر پاکستان نے مسلم ممالک کو بھی نظر انداز کر دیا، یہاں تک کہ سویز کے مسئلے پر بھی وہ مغرب کی صف میں کھڑا ہو گیا۔ وزیر اعظم سہروردی نے دسمبر ۱۹۶۵ء کو نیشنل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا "امریکہ اور برطانیہ جیسی بڑی قوتوں کے ساتھ بندھنے کے بجائے ہم مسلمان ملکوں کے ساتھ متحد کیوں نہیں ہوتے؟ میرا جواب ہے کہ صفر + صفر + صفر بہرحال صفر ہی رہے گا" (کے عارف، امریکہ پاکستان تعلقات --- دستاویزات (انگریزی) لاہور ۱۹۸۴ء۔ جلد ۱، ص ۱۲۵) ۲۲ فروری کو انہوں نے کہا "یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ ہماری پشت پر ایک طاقتور ملک ہے جو ہماری سالمیت اور سیاسی آزادی کی ضمانت دے رہا ہے" (دستاویزات، ص ۱۳۴) پھر ۲۵ فروری کو انہوں نے مزید کہا "وہ یہ یاد رکھیں کہ ہم دل وجان سے ان کے ساتھ ہیں --- اگرچہ ہم چھوٹے ہیں --- ان کو ہم سے زیادہ بڑا وفادار دوست نہیں ملے گا" (دستاویزات، ص ۱۲۸)

صدر ایوب نے جولائی ۱۹۶۰ء کو فارن افیئرز میں لکھا "پاکستان نے کھلم کھلا اور غیر

مشروط طور پر اپنی قسمت مغرب کے ساتھ وابستہ کر دی ہے" (دستاویزات ص ۱۱۸۷) ۱۷ جولائی ۱۹۶۱ء کو انہوں نے کہا "جب مشکل وقت پڑے گا' تو ایشیا میں پاکستان امریکہ کا واحد دوست ہوگا" (دستاویزات' ص ۲۰۳) امریکہ نے جب آنکھیں پھیرنا شروع کیں تو مسٹر بھٹو نے ۲۴ جولائی ۱۹۶۳ء کو نیشنل اسمبلی میں گلہ کیا "ہم نے مغرب کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ مسٹر خروشچیف نے ہمیں دھمکی دی کہ پاکستان کو نیست ونابود کر دیا جائے گا۔ ہم نے اپنا پورا مستقبل مغرب کے ساتھ اتحاد کر کے داؤ پر لگا دیا۔ دونوں کے درمیان جنگ کی صورت میں ہم نے نیو کلیر جنگ کا خطرہ مول لیا لیکن آج کیا ہو رہا ہے؟" (دستاویزات' ص ۲۲۳)

پاکستان نے' جو امریکہ کا یار وفادار رہا ہے اور اب بھی ہے' اگر امریکہ کے علاوہ کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھا تو امریکہ نے اس کی تذلیل وتحقیر بھی کی' اور سزا بھی دی۔ جب ۱۹۶۲ء میں امریکہ نے بھارت کو زبردست مقدار میں اسلحہ دیا تو صدر ایوب نے جوابی کارروائی کے طور پر مارچ ۱۹۶۳ء میں چین کے ساتھ سرحدی معاہدہ کر لیا' پھر پیکنگ تک فضائی سروس شروع کر دی اور ۱۹۶۴ء میں جاسن کی طرف سے ویت نام میں فوجی دستے بھیجنے کی خواہش کے "احترام" سے انکار کر دیا۔ صدر جاسن نے اپنی ناراضی ظاہر کرنے کے لیے اپریل ۱۹۶۵ء میں ایوب کا مجوزہ دورۂ امریکہ منسوخ کر دیا اور ۱۹۶۵ء میں ہونے والی پاکستان کے امدادی کنسورشیم کی میٹنگ بھی منسوخ کرا دی۔ گویا امریکہ ایک عالمی طاقت ہونے کی حیثیت سے آزاد تھا کہ جس سے چاہے "تعلق" قائم کرے اور پاکستان سے جیسا چاہے' سلوک کرے۔ پاکستان کو ایک چھوٹے' محتاج اور باج گزار ملک ہونے کی وجہ سے یہ اجازت نہ دی جا سکتی تھی کہ وہ ہرجائی پن کا مظاہرہ کرے۔

امریکہ سے ہم کوئی گلہ شکوہ کرنا صحیح نہیں سمجھتے۔ اس نے ہمیں کبھی دھوکے میں نہیں رکھا۔ اس کی پالیسی آغاز ہی سے یکساں اور واضح رہی ہے۔ ہم ہی نے جھوٹے توقعات باندھیں اور خود فریبی میں مبتلا رہے۔ اس کی پالیسی بین الاقوامی سیاست کے اس معروف اصول کے عین مطابق رہی ہے کہ "کوئی دوست' مستقل دوست نہیں ہوتا' اصل دوستی صرف اپنے مفادات سے ہوتی ہے" ہمارا گلہ شکوہ ہے تو اپنے حکمرانوں سے ہے۔ انہوں نے اپنے مفادات کو فراموش کر دیا' آنکھیں بند کر کے امریکہ سے مستقبل دوستی گانٹھی۔ اس کی پشت پناہی کو کافی سمجھا اور پے در پے بین الاقوامی سیاست کی تلخ حقیقتوں سے دوچار ہونے کے باوجود انہی پتوں پر آج بھی تکیہ کیے ہوئے ہیں۔

تعلقات کی تشکیل نو کا چیلنج

آج درون پردہ کیا ہو رہا ہے؟ اس سے ہم زیادہ باخبر نہیں۔ لیکن محسوس یہی ہوتا ہے کہ ماضی کے سارے اسباق، سیاست عالم میں دور رس تبدیلیوں، اور دنیا میں برپا تہذیبی کشمکش کے باوجود یہ تعلقات ماضی کی نہج سے کچھ زیادہ مختلف انداز میں پروان نہیں چڑھ رہے۔ امریکہ کی طرف سے وہی بھارت نوازی اور پاکستان پر چاند ماری ہے، ایٹمی پروگرام سے دست برداری اور منڈیاں کھول دینے پر اصرار ہے، کہ اب کمیونزم کے زوال کے بعد ایک طرف اڈوں، میدان جنگ اور کرایہ کے سپاہیوں کی ضرورت ختم ہو گئی ہے اور دوسری طرف چاند ماری میں شدت سے کسی نقصان کا خدشہ بھی نہیں ہے۔ پاکستان کی طرف سے وہی ڈالروں اور اسلحہ کے لیے گدائی، اور اس کے عوض امریکی مطالبات کی تکمیل۔

بلا شبہ امریکہ کے ساتھ خوش گوار تعلقات ہماری قومی وسیاسی ضرورت بھی ہیں اور نظریاتی بھی۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ ان تعلقات کی نئے خطوط پر تشکیل نو کی شدید ضرورت ہے۔

۱۔ اس تشکیل نو کے لیے سب سے پہلے سیاست عالم کا صحیح ادراک ضروری ہے۔ ہمارا ترپ کا پتا امریکہ کا کمیونزم کی توسیع کا خوف تھا۔ اب یہ پتا ہمارے ہاتھ میں نہیں رہا۔ بھارت کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت کی روک تھام کرنا، یا اس کے ساتھ عدم توازن کو کم کرنا امریکہ کے ایجنڈے میں کوئی مقام نہیں رکھتا بلکہ اس کے برعکس اس کا مفاد یہ ہے کہ بھارت کی طاقت بڑھتی رہے، ہم اپنی حدود میں رہیں، جارحانہ اسلحہ حاصل نہ کریں اور اس کی بالادستی تسلیم کر لیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اب ہمارے کوئی کارڈ نہیں رہ گئے۔

۲۔ اسی طرح مستقبل کی تہذیبی کشمکش کے امکانات اور نہج کا صحیح ادراک بھی ضروری ہے۔ مغرب کے اندازے اور منصوبے اور ہمارے اپنے اہداف اور کرنے کے کام کیا ہیں؟ اس لیے کہ مغرب نے "اسلامی خطرہ" کا جو تصور بنا لیا ہے، اس کے ہمارے تعلقات پر گہرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں اور یہ مزید گہرے ہوتے جائیں گے۔ لیکن اسلام کو "خطرہ" کے بجائے ایک "امکان" بنانا ممکن ہے۔

۳۔ یہ جاننا چاہئے کہ ان تعلقات کو خوش گوار رکھنے کے لیے یہ ضروری نہ ہونا چاہئے کہ ہم امریکہ کے دست نگر بھی ہوں یا اس کے ہر مطالبے کے آگے سر جھکاتے چلے جائیں۔ اپنے اہداف کے واضح شعور کے ساتھ ثقافتی ومعاشی محتاجی وگدائی سے نجات پا کر ہمارے لیے یہ ممکن ہونا چاہئے کہ اپنے اہم اور حساس قومی مفادات اور اپنی دینی ونظریاتی

حیثیت قربان کیے بغیر بھی لین دین کے اصول پر خوش گوار تعلقات رکھ سکیں۔

۴۔ امریکہ ایک بڑا طاقت ور ملک ہے' غالب مغربی تہذیب کا لیڈر ہے۔ اگرچہ اس کے مقابلے میں ہمارا ملک بہت چھوٹا ہے اور ہم نے اپنی غلط کاریوں سے اسے اور بہت "چھوٹا" کر دیا ہے۔ ۱۹۸۷ء کے ایک امریکی تجزیے کے مطابق "ایک انتہائی ضعیف حلیف' مفلس اور قلاش جس کی تاریخ سیاسی افتراق وعدم استحکام کی تاریخ ہے" (رابرٹ جی ورسنگ' پاکستان سکیورٹی انڈر ضیاء' لندن۔ ص ۱۱' ۱۲) ہمارے ہاتھ میں کارڈ پہلے بھی زیادہ نہ تھے' اب اور تھوڑے رہ گئے ہیں۔ اس لیے ہمیں یہ شعور ہونا چاہئے کہ یہ لین دین برابر کا ہونا دشوار ہے۔ لیکن تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ ایک کمزور فریق' اگر حکمت اور واضح حکمت عملی رکھتا ہو' تو کچھ زیادہ دے کر بھی آگے بڑھنے کا راستہ بنا لیتا ہے' بشرطیکہ ہمارے ماضی وحال کے حکمرانوں کی طرح پہلے ہی دل وجان سے غلام بننے کو تیار نہ ہو۔ صلاح الدین ایوبی نے لین دین میں جس نشیب وفراز سے گزر کر بیت المقدس دوبارہ فتح کیا' اس سے واقفیت ہی راہ نمائی کے لیے کافی ہے۔

۵۔ قومی سطح پر جذباتی انداز میں امریکہ پر چاند ماری (America-bashing) کو بھی ختم ہونا چاہئے۔ قرآن نے بتوں کو بھی برا بھلا کہنے سے منع کیا ہے۔ امریکہ سے اختلاف ہو سکتا ہے' اس پر سنجیدہ اور مدلل تنقید ہونی چاہئے' اس کی دو عملی سیاست کی نقاب کشائی بھی لیکن دشنام طرازی اور غیر منصفانہ تنقید ہمارے دین وایمان کے بھی منافی ہے' ہمارے قومی مفاد کے بھی۔ اس سے کچھ حاصل بھی نہیں۔

۶۔ ہمیں امریکی سیاسی نظام میں طاقت کے ہر مرکز سے اپنے اہداف کے حصول کے لیے رجوع کرنا چاہئے۔ ابتدائی دور کی دوستی "سنہرے لمحات" ایوب خاں جیسے لوگوں کے آئزن ہاور' جان فاسٹر ڈلس اور ایڈمرل ریڈ فورڈ جیسے لوگوں سے ذاتی تعلقات پر قائم تھے۔ جب ڈلس کا انتقال ہو گیا اور آئزن ہاور کی جگہ کینیڈی صدر ہو گئے تو ان کے تعلقات کے نیچے سے زمین سرکنا شروع ہو گئی۔ پاکستانی حکمرانوں نے امریکی حکومت کی دوسری شاخ' کانگریس اور سینٹ سے تعلقات کو کوئی اہمیت نہ دی اور امریکہ میں پاکستان کی کوئی لابی سرگرم کار نہ رہی۔ اب ہمیں وہاں اپنی مضبوط لابی بنانا چاہئے۔ پروفیشنل لابی بھی اور پاکستانی امریکن شہریوں کی لابی بھی۔

۷۔ باہمی تنازعات موجود ہیں اور رہیں گے لیکن ہمیں امریکی حکمرانوں اور پالیسی سازوں' جن سے ہم معاملات کرتے ہیں اور عام امریکی افسران اور عوام کے درمیان فرق

ملحوظ رکھنا چاہئے' اور انصاف اور حق کے حوالے سے براہ راست ان کے دل ودماغ سے اپیل کرنا چاہئے۔ امریکہ ہی میں یہ ممکن ہے کہ بوسنیا کے مسئلے پر اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے تین اعلیٰ افسران استعفیٰ دے دیں اور امریکن عوام امریکہ کو ویت نام اور صومالیہ سے نکلنے پر مجبور کر دیں۔

۸۔ ہمیں امریکہ کی تاریخ' ان کی جڑوں (Roots) اور نفسیات سے بھی آگاہ ہونا چاہئے۔ یہ ملک اللہ سے عہد (Convenant of God) کے ایفا اور حکومت الہیہ (Kingdom of God) کے قیام کی جستجو میں قائم ہوا تھا۔ اگرچہ اب مشہور سوشیالوجسٹ رابرٹ بیلا (Robert Bellah) کے الفاظ میں "نقض عہد کے نتیجے میں یہ میثاق' میثاق شکستہ (broken convenant) بن چکا ہے" اور امریکہ میں مادہ پرستی کا غلبہ ہے' لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس "میثاق" کے ورثے میں ہمیں ایسی بے شمار چیزیں مل جائیں گی جو کلمۃ سواء بیننا وبینکم کا مصداق ہوں۔ اپنی کمزوری اور عدم توازن کے باوجود ہم یہ مشترک اقدار ومفادات تلاش کر سکتے ہیں اور خوش گوار تعلقات میں یہ اپنا حصہ ادا کر سکتے ہیں۔

ہم ڈپلومیٹک عمل میں نئے متعین اقدامات کی نشان دہی نہیں کرنا چاہتے کہ یہ اس عمل سے پوری آگاہی کے بغیر اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہوگا۔

(ماہنامہ ترجمان القرآن' اگست ۱۹۹۴ء)